مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

ایک مثالی شخصیت

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ

ہندوستان کے چند شہرہ آفاق خاندانوں میں سے ایک نہایت برگزیدہ اور عالی نسب خاندان سادات حسنی کا وہ مبارک سلسلہ ہے جس کا پہلا وطن نصیر آباد اور دوسرا تکیہ کلاں (دائرہ شاہ علم اللہؒ) رائے بریلی ہے، اس خانوادۂ علم و عمل کی مشہور شخصیات حضرت شاہ علم اللہ (خلیفہ حضرت سید آدم بنوری مجددی) اور حضرت شاہ ابو سعید (تلمیذ حضرت شاہ ولی اللہ کے مرتبہ و مقام سے کون اہل نظر ناواقف ہے۔

اس طرح اس خاندان کے افراد نسبت ولی اللہی اور مجددی کے جامع، اور ان کے علوم و معارف کے امین تھے اور بقول علامہ سید سلیمان ندوی:-

"اس میں مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا فیض آکر مل گیا تھا۔"[1]

تیرھویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی تحریک اور توحید و سنت کی تجدید اسی مبارک خانوادہ کے ذریعہ ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ اسی گھرانے کے شب چراغ تھے جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا ٹمٹماتا چراغ روشن، توحید کا غلغلہ بلند، اور اتباع سنت کا ولولہ تازہ ہوا، ان کی کاوشوں کا عکس آج بھی، دل فروز اور ملت کے لیے مینارۂ نور ہے۔ اور کہا جاسکتا ہے کہ اس برصغیر کے بیشتر تعلیمی و تبلیغی سلسلے انھیں کے سوز دروں کی بازگشت۔ اور انھیں کی کاوشوں کا پرتو ہیں، جس کے اثرات سے ہندو پاک کا خطہ

[1] مقدمہ سیرت سید احمد شہیدؒ صفحہ ۱۷ (لکھنؤ، ۱۳۹۰ھ)

سورہ اور ذرہ ذرہ درخشاں ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند!

حضرت سید احمد شہیدؒ کی قدردانی میں اہل خاندان بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے، چنانچہ خاندان کے ان خوش نصیب افراد میں جو حضرت سید صاحب سے بیعت اور خلافت باطنی سے سرفراز ہوئے۔ مولانا میر عبد العلیؒ اپنے علمی و عملی کمالات میں ممتاز تھے۔ ان کے صاحبزادے مولانا حکیم فخر الدین خیالیؒ اور ان کے نامور فرزند مولانا عبد الحئیؒ رائے بریلوی تھے، مولانا

لہ حضرت سید احمد شہید کے ہم جد ہیں ان کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت پر حضرت سید احمد شہید سے مل جاتا ہے، مولانا میر عبد العلی فاضل عالم، شعر و سخن کے ذوق سے بہرہ ور نہایت خلیق و فیاض، درویش صفت اور نیک و صالح بزرگ تھے۔ باوجود تحصیلدار ہونے کے (جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز اور اہم عہدہ سمجھا جاتا تھا) فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، نقاشی و خوش خطی کا بھی عمدہ ذوق تھا، عربی میں علی اور ریختہ میں ہجر تخلص کرتے تھے۔ ۱۲۶۹ھ میں وفات پائی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔ نزہۃ الخواطر ج۷ ص۲۸۴ اور حیات عبد الحئی ص۸۔۱۱

سے مولانا حکیم فخر الدین خیالی ۱۲۵۸ھ میں ولادت ہوئی، نامور اساتذہ اور ممتاز علماء سے تعلیم پائی۔ وہ جید عالم، ادیب و انشاء پرداز اور فارسی، اردو، اور بھاشا کے باکمال شاعر تھے، امیر اللہ تسلیم لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ اور مولانا سید محمد ظاہر نقشبندی حضرت مولانا خواجہ احمد صاحب نصیر آبادی سے طریق نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی، اعلیٰ درجہ کے خوش نویس تھے نسخ و نستعلیق اور خط شفیعہ بہت عمدہ لکھتے تھے۔ تصانیف کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا جس میں "مہر جہانتاب" اس عہد کا عظیم ترین علمی اور تاریخی کارنامہ ہے۔
۱۰ رمضان ۱۳۲۶ھ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں وفات پائی، مفصل حالات کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ نزہۃ الخواطر ج۸ ص۳۵۴۔۳۵۰ اور حیات عبد الحئی ص۱۴۔۲۶

سے خانوادہ حسنی کے نامور فرزند، ندوۃ العلماء کے ناظم، اسلامی ہند کی تاریخ کے رمز آشنا، نزہۃ الخواطر، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، جنۃ المشرق اور گل رعنا جیسی قیمتی کتابوں کے مصنف، اور گوناگوں علمی و مذہبی خدمات کی وجہ سے شہرۂ آفاق ہیں۔ ۱۸ رمضان ۱۲۸۶ھ (۲۲ دسمبر ۱۸۶۹ء) میں ولادت ہوئی، اور تقریباً پچپن سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ ۲۲

---

۲۲ فروری ۱۹۲۳ء) میں وفات پائی۔ مزید معلومات کے لیے دیکھیے حیات عبد الحئی از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔

عبدالحیؒ کے دو صاحبزادے ہوئے (مولانا) ڈاکٹر سید عبدالعلی (انھیں کا تذکرہ یہاں مقصود ہے) اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔

الخیل واللیل والبیداء تعرفھم
والسیف والرمح والقرطاس والقلم

ولادت و مکتب نشینی!

ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ (یکم دسمبر ۱۸۹۳ء) کو دین و دیانت کے گہوارہ اور علم و معرفت کے ماحول فتحپور ہسوہ[1] میں جو ان کا ننھیالی وطن تھا پیدا ہوئے، ہسوہ ہی میں بسم اللہ خوانی کے بعد مولانا عبدالحکیم صاحب[2] کیرانوی کے پاس مکتب نشینی ہوئی، قرآن پاک اور اردو کی تعلیم ان ہی کے زیرسایہ حاصل کی۔

وہیں فارسی کی ابتدا ہوئی، مولانا عبدالحیؒ اس وقت لکھنؤ میں تھے، وہ ان کی تربیت اور تعلیمی کیفیت کی نگرانی رکھتے۔ اور خطوط کے ذریعہ رہنمائی فرماتے رہتے، ایک خط میں (جو ۵ جولائی ۱۹۰۵ء کو لکھنؤ سے روانہ ہوا) لکھتے ہیں:-

"صبح کو پہلے تلاوت قرآن شریف مکتب میں جاکر کیا کرو، ربع سے کم نہ ہو، اس کے بعد اصول فارسی

---

[1] قصبہ ہسوہ ضلع فتحپور کا ایک مردم خیز علاقہ ہے۔ ساتویں صدی میں ایک بزرگ سید علاء الدین شہید جو مجاہد کبیر امیر قطب الدین المدنی کی جماعت میں سے تھے یہاں آئے اور اس کے قلعے کو فتح کیا اور شہید ہوئے اس کے بعد اس علاقہ میں بے شمار بزرگ اور علماء پیدا ہوئے جو سادات حسینی واسطی کے چشم و چراغ تھے اس خاندان میں مولانا سید محمد مہدی، مولانا ابوالقاسم، مولانا سراج الدین (خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ) مولانا عبدالسلام صاحب (خلیفہ شاہ احمد سعید مجددی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[2] کیرانہ ضلع مظفرنگر (یوپی) کے رہنے والے بابرکت بزرگ اور حقانی عالم تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے شاگرد اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ ڈاکٹر عبدالعلی ان سے بے حد متاثر ہوئے، آخر عمر تک بہت بلند الفاظ سے ان کا تذکرہ کرتے تھے۔

مستفاد از حیات عبدالحیؒ ص۴۳

شروع کرو، اور دوسرے وقت فارسی کی دوسری، اور برابر لکھتے رہو کہ کس قدر ہوئی، اصول فارسی کو سمجھ کر پڑھنا اور زبانی یاد کرنا، علاوہ اس کے اپنے خط کو درست کرو اور فارسی رقعے لکھو۔ [۱]

اس کے بعد والد ماجد نے یہ پسند کیا کہ ان کا زیادہ وقت حکیم فخر الدین خیالی کے پاس جو ان کے دادا تھے گزرے تاکہ یہ ان کے ذوق ادب سے استفادہ کریں اور فارسی ادب و انشا میں کمال اور خوشنویسی میں پختہ استعداد بہم پہنچائیں۔ فارسی کی تکمیل کے بعد لکھنؤ چلے گئے، تھے جہاں اس وقت والد محترم ناظم ندوۃ العلماء تھے، اور نامور اساتذہ درس کی مجلسیں سجائے ہوئے تھے۔ ان سے فیضان پایا۔ اسی دوران مشہور محدث شیخ حسین بن محسن یمانی لکھنؤ آئے تو ان سے اجازت حدیث حاصل کی۔

دار العلوم دیوبند میں!

اس وقت دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا دریائے فیض جاری تھا، اور تشنگان علم سیراب ہو رہے تھے، اسی دریائے فیض سے استفادہ کے لیے ڈاکٹر عبد العلی بھی ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۰ء میں دار العلوم پہنچے، حضرت شیخ الہند نے سید احمد شہید کی نسبت اور مولانا عبد الحئی کے تعلق سے، بیحد اکرام فرمایا، ان کے لیے گھر سے کھانا بھی اکثر خود ہی لاتے جس سے ڈاکٹر صاحب کو نہایت شرمندگی ہوتی، حضرت کے یہاں قیام بڑی سعادت تھی مگر حضرت کی اس تکلیف فرمائی کے خیال سے دار الاقامہ منتقل ہو گئے اور وہاں ایک سال قیام کیا، بخاری و ترمذی مولانا محمود الحسن سے، ابوداؤد حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سے پڑھی اور سالانہ امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کے حسن اخلاق اور علمی انہماک سے اساتذہ بیحد متاثر ہوئے۔ انکی سلامت طبع اور علوئے استعداد کی وجہ سے اساتذہ خصوصاً حضرت شیخ الہند کو ان کی دینی و علمی مصروفیات پر نظر اور اس مقصد میں مشغول رہنے کی فکر رہی جس کے لیے دیوبند کا سفر ہوا تھا، حضرت شیخ الہند خطوط کے ذریعہ اس کی معلومات فرماتے رہتے۔

---

[۱] حیات عبد الحئی ص ۳۴۴

طب یونانی کی تعلیم!

طب خاندانی مشغلہ تھا، والد صاحب اور دادا دونوں فاضل طبیب تھے، یوں بھی طب اس زمانہ میں آزاد اور باعزت ذریعہ معاش سمجھا جاتا تھا، اور اس کے ساتھ دینداری اور عملی مشاغل کے لیے بڑی گنجائش تھی۔ اس لیے والد صاحب سے طب کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کی مشق شروع کی، پھر والد ماجد کے مشورہ سے دہلی پہنچکر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی بے نظیر حذاقت ومہارت اور وسیع تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور ساتھ ہی ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری سے ایلوپیتھک میں استفادہ کیا۔

انگریزی تعلیم!

دہلی سے واپس آئے تو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا، نہایت خوشی سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر سٹی نیل اسکول میں داخلہ لے لیا، یہ مشنری اسکول تھا جس میں طلبا، زیادہ تر خوش حال اور مغربی ماحول کے پروردہ تھے۔ اور اکثر استاد بھی عیسائی اور یوروپین تھے، یہ فضا دینی مزاج رکھنے والے طلباء کے لیے بڑی امتحان گاہ تھی، لیکن خاندانی اثرات اور تربیت کا کمال تھا جس نے اس ماحول میں بھی مذہبی معمولات، وضع قطع اور لباس میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ سادہ معمولی لباس، اور نمازوں کی پابندی اسی طرح رہی جس طرح اس سے پہلے تھی۔

اس اسکول سے امتیازی حیثیت سے میٹری کولیشن کا امتحان ۱۹۱۵ء میں پاس کیا، اور قیمتی کتابیں انعام میں حاصل کیں، انٹر کے بعد لکھنؤ کے مشہور کرسچین کالج میں انٹرمیجیٹ کے لیے داخلہ لیا، اور عربی فارسی تاریخ، ادب وغیرہ مضامین (جونسبۃً ان کے لیے سہل تھے) کے بجائے انگریزی لٹریچر، علم الحیات، طبعیات، اور کیمیا کے مشکل موضوعات کا انتخاب کیا جس سے ان کی عالی ہمتی اور بلند نگہی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایف ایس سی کے بعد اسی سال کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، اور ۱۹۱۹ء میں بی ایس سی کے امتحان میں امتیاز سے کامیاب ہوئے کیننگ کالج میں پہلی اور الہ آباد یونیورسٹی میں جس سے یہ کالج ملحق

تھا۔ دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس میں خاص مضمون علم نباتات تھا، اس کامیابی پر ۱۹۱۹ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں دو تمغے ملے جس میں ایک تمغہ سونے کا تھا۔

میڈیکل کالج میں داخلہ

اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں بھی اسی مومنانہ شان سے وقت گزارا اور مذہبی معمولات میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیا، جو بجائے خود ایک بڑا کارنامہ، پختگیٔ ایمان اور سلامت طبع کی دلیل ہے۔

ایک مرتبہ امتحان ہال میں نماز کا وقت آگیا تو انھوں نے وہیں شیروانی بچھا کر نماز شروع کردی، نگراں امتحان نے دیکھا اور جب یہ نماز سے فارغ ہو گئے تو آکر معذرت کی اور کہا کہ "اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ آپ کی عبادت اور نماز کا وقت ہے تو ہم چٹائی یا فرش کا انتظام کر دیتے۔"

کالج کا انگریز پرنسپل ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی فن سے مناسبت اور اصابت رائے کا بیحد معترف تھا، بعض مرتبہ پرنسپل کی طبیعت خراب ہوتی یا کوئی اہم کام ہوتا تو مریض کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بھیجدیتا۔

والد صاحب کا انتقال

میڈیکل کی تعلیم کا تیسرا یا چوتھا سال تھا ڈاکٹر صاحب کالج کی طرف سے زنانہ امراض کے مطالعہ کے لیے مدراس میڈیکل کالج کے دورہ پر گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں سے گول کنڈہ حیدرآباد وغیرہ کے تاریخی مقامات دیکھتے ہوئے واپس ہو رہے تھے کہ بمبئی میں والد ماجد کے انتقال کی الم ناک خبر ملی، فوراً لکھنؤ پہونچے تو گھر کی بساط الٹ چکی تھی اور چمن اجڑ گیا تھا، ڈاکٹر صاحب نے بڑی پامردی اور استقلال سے اس افتاد کا مقابلہ کیا اور خاندان کی کفالت و معاش کی ذمہ داریوں سے بڑی حد تک کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے۔

ایم بی بی ایس کی ڈگری اور مطب!

۱۹۲۵ء(۱۳۴۴ھ) میں میڈیکل کے آخری سال کا امتحان دیا، اور ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور رجب ۱۳۴۴ھ (جنوری ۱۹۲۶ء) میں اپنا مطب (پریکٹس) شروع کیا، چونکہ یونانی اور ایلوپیتھک دونوں کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی اور دونوں ہی میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا مطب کم از کم لکھنؤ میں اس طرح کا پہلا مرکز تھا، عرصہ تک اسی جامعیت کے ساتھ مطب کرتے رہے غالباً ۱۹۳۰ء میں ہومیو پیتھک طریقہ علاج کا مطالعہ کیا اور اس کی تاثیر کے قائل ہو گئے تھے۔ اس لیے آخری سالوں میں اسی طریقہ علاج کو ترجیح دینے لگے تھے، حالانکہ اس سے آمدنی کو خاصا نقصان پہنچا مگر انھوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ وہ دیانت دارانہ علاج اور مریض کے نفع کو اپنی آمدنی سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔

مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت

خاندانی ماحول، تربیت اور ذہنی انقیاد کا تقاضا تھا کہ خود کو کسی مرد باخدا کے حوالہ کر کے ان کے زیر سرپرستی مراحل حیات اور راہ سلوک طے ہو، اس کے لیے نظر انتخاب مولینا محمود الحسن دیوبندی (شیخ الہند) پر گئی، مگر ان سے بیعت ہونے کا موقعہ نہیں آیا تھا کہ وہ رحلت فرما گئے۔ اس لیے ان کے جانشین اور ان کے علم و معرفت کے امین مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا، اور زندگی بھر اس تعلق کو نبھایا، اور حضرت مولانا مدنی کو بھی ان سے بے حد محبت و مناسبت اور قلبی تعلق تھا جو سخت ترین حالات سے بھی متاثر نہیں ہوا۔

مشائخ عصر کی خدمت میں!

حضرت مولانا مدنی سے بیعت و استفاضہ کے تعلق کے ساتھ ساتھ دوسرے اہل اللہ اور مشائخ عصر سے بھی بڑی عقیدت و محبت تھی، ان کی خدمات میں حاضری اور ملاقات کو باعث سعادت اور سرمایۂ آخرت جانتے تھے، چنانچہ جب حکیم الامت مولانا اشرف علی

تھانوی ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ تشریف لائے تو ڈاکٹر صاحب کا ان کی مجلس میں روزانہ حاضری کا معمول تھا، اور حضرت بھی شفقت فرماتے، حضرت تھانوی لکھنؤ کے اس چالیس روزہ قیام میں کسی کے مکان پر نہیں گئے، لیکن ایک روز خود ہی ڈاکٹر صاحب سے فرمایا "میرا آپ کے گھر آنے کا جی چاہتا ہے، اور میں بعد مغرب چلوں گا" حسب ارشاد مغرب کے بعد تشریف لائے اور ایک گھنٹہ قیام کے بعد واپس ہو گئے۔[1]

اس کے بعد دوبارہ جب ۱۹۴۱ء میں حضرت تھانوی کی لکھنؤ تشریف آوری ہوئی تو اس دوران بھی ڈاکٹر صاحب پابندی سے حاضر ہوتے رہے، اور حضرت کی مجالس میں شرکت کرتے رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے قیام لکھنؤ کے موقعہ پر بھی ڈاکٹر صاحب بہت اہتمام سے مولانا کی مجالس میں شریک ہوتے، اور حضرت مولانا بھی کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، ایک مرتبہ فرمایا: "ڈاکٹر صاحب بڑے بابرکت آدمی ہیں"

خاندان فرنگی محل سے تو دیرینہ روابط اور خاندانی مراسم تھے، ڈاکٹر صاحب کے زمانہ میں یہ تعلق اور زیادہ قریبی ہو گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب فرنگی محل کے عمومی معالج بن گئے تھے۔

مولانا عبدالشکور صاحب کاکوروی سے بھی قدیم تعلقات تھے، ان کی پاکیزہ نفسی للہیت اور بے غرض خدمات کے ڈاکٹر صاحب بے حد معترف تھے۔

مولانا محمد الیاس صاحب سے عقیدت!

ڈاکٹر صاحب کو حضرت مولانا محمد الیاس سے بےحد عقیدت اور ان کی تبلیغی جماعت سے گہری وابستگی تھی، جب مولانا محمد الیاس رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں لکھنؤ تشریف لائے اور ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام ہوا تو کچھ وقت ڈاکٹر صاحب کے مکان پر بھی گزارا۔ ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے کچھ ایسی محبت و انسیت تھی کہ باوجود سفر کی عادت نہ ہونے کے نظام الدین تشریف لے گئے۔ اور کئی روز مولانا کی خدمت میں رہے۔ مولانا کو اس آمد سے بےحد مسرت ہوئی، اور جب ڈاکٹر صاحب رخصت ہونے لگے تو مولانا نے یہ شعر پڑھا

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد ۔۔۔ روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب سے جو تعلق تھا وہ ان کے وصال کے بعد مولانا کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسف

[illegible]

---

[1] اور اسی موقع پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد الحسنی کی جو اس وقت ۴ سال کے تھے بسم اللہ کرائی۔

مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

ایک مثالی شخصیت

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ

(۲)

سفر حج!

مطب شروع کئے ہوئے ابھی چھ سات مہینے گزرے تھے کہ زیارت حرمین کا خیال ہوا، اور ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں حج کے لیے روانہ ہوگئے، مدینہ طیبہ میں وہاں کے مشہور شیوخ محمد بن احمد العمری المغربی المالکی، مدرس حرم نبوی، اور شیخ محمود بن احمد الشبیر...... باسم السوئی التیجانی مہاجر سے حدیث کی سند و اجازت حاصل کی، اور شیخ الاسلام کے مشہور کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

اس سفر میں حرمین کے برکات و انوار کے نزول اور کیفیات و تجلیات کے مشاہدہ کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اسی سال سلطان عبد العزیز نے موتمر اسلامی منعقد کرانے کا فیصلہ کیا تھا، جس میں جمعیۃ علماء ہند کا وفد مولانا مفتی کفایت اللہ کی قیادت میں، خلافت کا وفد مولانا سید سلیمان ندوی کی امارت میں جا رہا تھا، اور مولانا خلیل احمد انبہوی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا حبیب الرحمان خان شروانی (صدر یار جنگ)، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ثناء اللہ امرتسری وغیرہ علماء ہندوستان سے اور بہت سے علماء مصر و شام سے اس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر سے ملاقاتیں

ہوئیں۔ اور سلطان ابن سعود سے بھی ملے، اور یہ سفر دینی و علمی برکات کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور ناظم ندوہ

مولانا عبدالحیٔ کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے انتخاب ہوچکا تھا۔ اس وقت نواب سید حسن علی خاں ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ نواب صاحب کی خرابی صحت کی بنا پر ربیع الآخر ۱۳۴۶ھ (اکتوبر ۱۹۲۷) میں ڈاکٹر صاحب نائب ناظم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۳۴۹ھ میں نواب صاحب کی مسلسل علالت کی بنا پر آٹھ نو مہینے بحیثیت قائم مقام ناظم فرائض انجام دیتے رہے، محرم ۱۳۵۰ھ میں نواب صاحب نے اپنی معذوری کی وجہ سے استعفیٰ دیدیا، مجلس منتظمہ نے استعفیٰ منظور کرلیا، اور اس کے ساتھ ہی دوسری تجویز کے ذریعہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا گیا[1] ڈاکٹر صاحب تیس برس اس ممتاز عہدہ پر فائز رہے۔ اور اس تیس سالہ عہد نظامت میں ان کی اصابت فکر، دور بینی و دوراندیشی، معاملہ فہمی اور حسن انتظام سے ندوۃ العلماء کو بے حد فائدہ پہنچا۔ ندوہ نے ان کے عہد میں بے حد ترقی کی۔ ان کے دور کو ندوۃ العلماء کا زریں عہد اور یادگار زمانہ کہا جاسکتا ہے۔

ان کے دور کی اہم خدمات و خصوصیات!

ان کے دور انتظام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ انھیں ندوہ کے اراکین انتظامی اور فرزندان ندوہ کی بڑی تعداد کا اعتماد و تعاون حاصل رہا۔ جس میں خصوصیت سے علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی قابل ذکر ہیں۔

طلبہ میں اسلامی ماحول کا احیاء

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں ندوۃ کو منجملہ دوسری کامیابیوں کے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی پختگی، دینی مزاج، اور تبلیغی کوششوں سے طلباء میں دینی رجحان

[1] نزہۃ الخواطر ج۸ میں نظامت کے لیے ۱۳۴۴ھ میں منتخب ہونا ذکر کیا گیا ہے جو بظاہر سہو ہے۔

بیدار ہوا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندرونی ماحول اور طلباء میں حسن اخلاق و معاشرت، شعائر اور شعائر دین کے مزید احترام و عمل کا جذبہ نمایاں ہوا جس سے بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "دارالعلوم (ندوۃ العلماء) کو ہر حیثیت سے بیش قیمت فائدہ حاصل ہوا"۔

عربی کے نئے نصاب کی تدوین

ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں ندوہ نے اپنا عربی نصاب تیار کیا، جو نہ صرف ہندوستان بلکہ متعدد عرب ممالک کے اسکولوں اور کالجوں میں داخل درس ہے، اس نصاب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:-

"ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں کئی مفید اور اہم اقدامات عمل میں آئے جن کا اثر ندوۃ العلماء کے حلقہ کے حدود سے متجاوز ہو کر دور دراز گوشوں تک پہنچا، ان میں سے ایک اہم اقدام عربی زبان وادب کے مستقل نصاب اور درسی کتب کی تیاری تھی جو خود دارالعلوم کے اساتذہ کے ہاتھوں عمل میں آئی"[1]

چند سطروں کے بعد اس کی تفصیل ان الفاظ میں قلمبند ہے:-

"ڈاکٹر صاحب کے دور نظامت میں یہاں عربی کی پہلی کتاب سے لیکر نثر عربی کی آخری کتاب تک ایک ایسا مکمل نصاب تیار ہو گیا، جس نے عرب فضلاء اور مصر و شام کے ماہرین تعلیم سے بھی داد تحسین حاصل کی اور ان میں سے متعدد جامعات و مدارس کے نصاب میں داخل کی گئیں"[2]

ڈاکٹر صاحب ہی کے دور نظامت میں ندوۃ العلماء کے عربی ترجمان "ماہنامہ البعث الاسلامی" اور پندرہ روزہ "الرائد" جاری ہوئے، جو اپنی اصابت و صلابت، دینی مزاج اور ادبی حیثیت سے دنیائے اسلام کے ممتاز و باوقار مجلات میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ندوۃ العلماء کے لیے ڈاکٹر صاحب کی خدمات ایک وسیع باب کا موضوع ہیں، مختصراً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ:-

---

[1] و [2] ندوۃ العلماء کے پچاسی سال ص۲۲

دارالعلوم کا یہ نیا عہد اور اس کا نیا دینی رجحان انھیں کے خلوص و فکر کا رہین منت ہے، اور جب کبھی ندوۃ العلماء کی تاریخ مرتب ہوگی، اور اس کی ترقیات و اصلاحات کا سراغ لگایا جائے گا، تو ان میں سے اکثر کا تعلق انھیں کی ذات اور انھیں کے دورِ نظامت سے ثابت ہوگا۔[1]

تبلیغی جدوجہد!

مسلمانوں میں دینی حمیت، مذہبی بیداری، اور اسلامی زندگی کے احیاء کے لیے مولانا محمد الیاس کے برپا کردہ تبلیغی نظام کے لیے مسلسل جدوجہد میں مصروف رہتے، خود بھی اس میں وقت لگاتے اور رفقاء و متعلقین کو بھی اس طرف متوجہ کرتے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندرونی ماحول اور طلبا کی دینی اصلاح کے لیے بھی اس کو بہت ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی کوششوں سے ندوہ کے دینی ماحول میں غیر معمولی بہتری اور اصلاح ہوئی۔ اس سے ایک طرف تو سلسلۂ تبلیغ کو ذی علم اور مخلص کارکن ملے جن کے تعاون سے کام کے پھیلانے میں بے حد مدد ملی اور دوسری طرف ندوۃ العلماء کے عزت وقار میں اضافہ ہوا، اور بڑے منافع حاصل ہوئے، جس کا اعتراف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

> "دوسری چیز جس نے دارالعلوم کو دینی حلقوں اور عامۃ المسلمین میں روشناس و مقبول بنایا وہ حضرت مولانا محمد الیاس کی دینی دعوت سے اس کا تعلق ہے۔ دعوت کے اس تعلق نے اس کے دینی رجحان کو بڑی قوت بخشی، اور خود اس کے اندر نئے جذبات، اور نئی زندگی پیدا ہوئی اور اس کے طلبا، اساتذہ اور کارکنوں کو عام دینی خدمت کا موقعہ ملا۔"[2]

غیر مسلموں میں تبلیغ!

مسلمانوں کی اصلاح کے لیے تعلیمی و تبلیغی کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ غیر مسلموں کے

---

[1] کارروائی جلسہ انتظامیہ ندوۃ العلماء منعقدہ ۸ اگست ۱۹۵۰ء ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱

پسماندہ طبقوں اور برادریوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے، اس موضوع میں ان کے لیے بڑی کشش تھی، اس کے لیے خود بھی ممکنہ سعی کرتے۔ اور ندوۃ العلماء کے فضلاء کی بھی خدمات حاصل کرتے، اور ان کو اس کی اہمیت کا احساس دلاتے رہتے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں جب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پہلی مرتبہ مصر کے سفر پر گئے، تو ان کے نام خطوط میں بڑی دل سوزی کے ساتھ اس موضوع کی طرف توجہ دلاتے تھے، بالخصوص افریقہ میں اشاعت اسلام کے لیے سازگار فضا اور ان میں قبول حق کی استعداد، اور اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پر مفصل خطوط لکھتے تھے۔

مدینہ طیبہ کے مدرسہ علوم شرعیہ سے شغف!

ندوہ کی نظامت و مصروفیات کے بعد سب سے زیادہ دلچسپی اور محبوب کام مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ طیبہ کی امداد و اعانت سے تھی، بڑے ذوق و شوق سے اس کی خدمت میں مصروف رہتے تھے، اور اس کے لیے "معین مدرسہ علوم شرعیہ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ جس کے وہ خود صدر، مولوی اشرف علی دیوبندی ناظم، اور مولوی عبدالرؤف سرگرم کارکن تھے۔

ملکی اور سیاسی خدمات!

ندوۃ العلماء کی نظامت، مطب، تبلیغی اور تعلیمی مصروفیات، اور تھکا دینے والے معمولات کے باوجود ملکی اور سیاسی خدمات کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے، اپنے وقت کا ایک حصہ اور پوری توجہ اس کے لیے بھی صرف کرتے۔

چنانچہ جب ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۸ء) میں جمعیۃ علمائے ہند کا کل ہند اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو ڈاکٹر عبدالعلی اس کے صدر استقبالیہ منتخب ہوئے، اور اجلاس میں خطبہ استقبالیہ پڑھا جو اس استقبالیہ کے خطبات میں منفرد، بڑا حقیقت پسندانہ، پرمغز اور نہایت فکر انگیز تھا، انھوں نے اپنے اس خطبہ میں اس نکتہ پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ سیاسی قوت کی

اخلاقی بنیاد ہونی چاہیے۔

ذوقِ علمی اور استعداد!

اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ نہیں رکھا۔ لیکن نہایت سہولت و اطمینان سے تمام درسی کتابیں پڑھا سکتے تھے علمی استعداد اور درس کی صلاحیت کا تو اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کنگ میڈیکل کالج کی طالب علمی کے دوران ہی ۱۹۲۱ء میں ایک عرصہ تک تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ایک سال دارالعلوم (دیوبند) کے ایک منتہی طالب علم کو صحیح مسلم پڑھائی، حکیم عبدالقوی صاحب (مدیر صدق جدید لکھنؤ) نے طب کی اکثر کتابوں کا درس انھیں سے لیا، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ان سے متعدد کتابیں پڑھیں۔

عربی اور انگریزی کے مقابلہ میں فارسی کی استعداد عمدہ اور زیادہ پختہ تھی، فارسی میں بڑی روانی اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے، جس کا مشاہدہ افغانستان کے مشہور ادیب و شاعر محمد سرور خاں کی لکھنؤ آمد کے موقعہ پر ہوا۔

توازن و جامعیت!

وہ دارالعلوم (دیوبند) اور ندوۃ العلماء کے فارغ اُن درسگاہوں کی خصوصیات کے جامع انگریزی کے فاضل، مغربی علوم سے واقف، اور تہذیب مغرب کے رمز آشنا تھے، مشرق و مغرب کے اس امتزاج سے ان میں وسیع المشربی، کشادہ دلی، اور اعتدال و توازن کی صفات جمع ہو گئی تھیں۔

وہ ایک طرف تو نہایت متقشف، اسلامی عقائد و نظریات کی ابدیت پر گہرا یقین رکھنے والے اسلامی تہذیب کی پاکیزگی و برتری اور اسلاف متقدمین کی اخلاقی اور روحانی قوت، اور انسانی عظمت کے شدت سے قائل تھے، دوسری طرف تعلیمی اصول و خیالات جدید چیزوں کے مطالعہ اور دنیا سے واقفیت کے بارے میں اتنے ہی وسیع الخیال، حقیقت پسند اور غیر متعصب تھے۔

انداز تربیت!

ان کا انداز تربیت بڑا حکیمانہ اور گہری نفسیاتی واقفیت پر مبنی تھا، اس خوبصورتی وہ لطیف انداز سے تعلیم دیتے کہ وہ دل و دماغ کی گہرائیوں میں گھر کرلیتی۔ اس عنوان کی تفصیلات میں جائے بغیر یہ کہہ دینا زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کے کمال تربیت کا نمونہ مخدومنا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ذات بابرکات ہے۔ حضرت مولانا نے ان بلیغ الفاظ میں ڈاکٹر صاحب کے کمال تربیت کا ذکر کیا ہے،

وقد كان رحمه الله وكافاه أفضل مكافاة عطوفا
رؤوفا مربيا حكيما من أفضل ما عرفت من المربين[1]

وفات!

مولانا سید حسین احمد مدنی کی رحلت اور اسی سال اہلیہ کی وفات نے بہت مضمحل و افسردہ کردیا تھا جس کے اثر سے ہائی بلڈ پریشر کی شکایت پیدا ہوئی بعد میں قلب بھی متاثر ہوگیا۔ ۱۹۶۰ء میں مرض کا سخت حملہ ہوا مگر پھر افاقہ ہوگیا۔ اس کے بعد مرض عود کرتا رہا۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ ۹ مئی ۱۹۶۱ء کو مرض کا شدید ترین دورہ ہوا اور وہ مسیحا نفس جس کے دست شفا سے نجانے کتنے مریضوں نے شفا پائی تھی کوئی طبی امداد ملنے سے پہلے اپنے رب کے حضور جا پہنچا۔

حلیہ اور خصوصیات!

ڈاکٹر صاحب نہایت خوبصورت، صحتمند، سرخ و سفید رنگ، دوہرا بدن اور قد مائل بہ پستی تھا، طبیعت بڑی سادہ و جفاکش پائی تھی، اپنے تمام ضروری کام کپڑے سینا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا بوقت ضرورت خود ہی کرلیتے تھے گفتگو بہت دھیمی کیا کرتے تھے، اخیر عمر کی تیمارداری [illegible] صاحب [illegible] اور والد صاحب کی اطاعت و خدمت گزاری کے لیے بچپن ہی سے مشہور [illegible] واقعہ ہے جب ان کے [illegible] صاحب [illegible] جانے کی [illegible]

[1] [illegible]

جانے کے لیے فوراً آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ وہاں جانے سے پورا تعلیمی سال ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ بعد میں جب والد صاحب کو امتحان کا علم ہوا تو انھیں سختی منع کیا۔

تصانیف!

ڈاکٹر صاحب کی متنوع مصروفیات کے بعد اس بات کے لیے بہت کم گنجائش تھی کہ وہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال سکیں۔ مگر ان کی عالی ہمتی اور علمی ذوق اس منزل میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ ان کی علمی صلاحیتوں کی سب سے پہلی یادگار علامہ انور شاہ کشمیری کی تقاریر درس تھیں، جنھیں حضرت علامہ نے دیکھا اور پسند فرمایا تھا اور کہیں کہیں اپنے قلم سے تصحیح و اضافہ بھی کیا تھا، افسوس ہے یہ گنجینہ علوم ضائع ہو گیا۔

اردو میں پہلی تالیف مولانا عبدالحئی رائے بریلوی کے حالات پر مفصل مقالہ ہے، یہ مقالہ اسی سال لکھا گیا جس سال انھوں نے تعلیم سے فارغ ہو کر مطب کی ابتدا کی تھی۔ یہ مقالہ "یاد ایام" (تاریخ گجرات) کے ساتھ شاہی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس عام منعقدہ لکھنؤ ۱۹۴۸ء کا خطبہ استقبالیہ ان کی قلمی یادگار ہے۔ ایک رسالہ، ان کے علاوہ حکیم اجمل خاں کے مطب کے نسخے بھی ان کے قلم کے شاہکار ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ادبی ذوق، عربی مذاق، عالم اسلام سے واقفیت اور تاریخ کے وسیع مطالعہ و تحقیق کا صحیح اندازہ ان کی تالیف "جغرافیہ جزیرۃ العرب" سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے والد ماجد کی فرمائش پر لکھی تھی افسوس اس پر نظر ثانی اور طباعت کا موقع نہیں ملا۔

پسماندگان میں ایک صاحبزادہ مولانا محمد الحسنی[1] اور پانچ صاحبزادیاں یادگار ہیں۔

---

[1] مولانا محمد الحسنی مرحوم اردو کے صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز کی حیثیت سے معروف ہیں۔ [illegible] البعث الاسلامی [illegible] کتابوں کے مصنف ہیں [illegible] سیرت [illegible]
[illegible] ۱۳۹۹ھ [illegible]
[illegible]